اسلام میں سزائے ارتداد

(از عبد الحمید صدیقی)

حال ہی میں پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب ایس اے رحمان صاحب کی ایک کتاب (PUNISHMENT OF APOSTASY IN ISLAM) یعنی "اسلام میں سزائے ارتداد" منظرِ عام پر آئی ہے۔ کتاب کو ادارہ ثقافت اسلامیہ نے شائع کیا ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب کے تعارف میں بیان کیا ہے کہ پاکستان میں جو غیر مسلم آباد ہیں وہ نہ ذمی ہیں نہ مستامن بلکہ ان کی حیثیت معاہدین کی سی ہے جنہیں بانی پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اس امر کی ضمانت دی تھی کہ مسلم اکثریت کی طرح بالکل مساوی سطح پر ان کے بنیادی حقوق کی بھی حفاظت کی جائے گی۔ آگے چل کر موصوف رقم طراز ہیں "کہ پاکستان جو ملی جلی آبادی کا ملک ہے اس میں باہمی ہم آہنگی کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آزادیٔ ضمیر، اظہار رائے، اپنے مذہب کی اشاعت و تبلیغ اور اپنے اپنے مذہبی رسوم و رواج کا تحفظ دنیائے جدید میں اخلاق و قانون کے مطابق، ہر قوم کا مسلّم و مقدس حق ہے۔ مرتد کا معاملہ خصوصاً جب وہ اکثریتی آبادی سے متعلق ہو۔ باہمی تعلقات میں ایک اچھے اور با اصول مذہب کے لیے، آزمائش کی حیثیت رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری فقہی کتب میں قرآن و سنتِ معتبرہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا گیا اور فقہائے متقدمین کے دماغوں میں محض ارتداد اور ریاست سے بغاوت و غداری پر مشتمل ارتداد کے مابین کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ بس چپکے سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اسلام سے روگردانی کرنے والا ہر شخص سزائے موت کا مستوجب ہے جیسا کہ اسلام کا کوئی باغی اور محارب۔ اجتماعی و سیاسی میدان میں یہ نظریہ بڑے دور رس ردِ عمل کا حامل ہو سکتا ہے۔ اور ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اس کے نتیجے میں جوابی قانون سازی کی جا سکتی ہے اور بالآخر قانون کے دائرے میں لڑی جانے والی یہ جنگ اسلامی تبلیغی سرگرمیوں کے خاتمہ کا سبب بن سکتی ہے۔" صـ۲ـ۳

یہ اور اسی طرح کے دوسرے احساسات نے فاضل مصنف کو اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے اور آپ نے پاکستان کی نازک زمانہ۔ کہ عین اُس لمحہ میں جب کہ دستور زیرِ تشکیل تھا قوم کے دستور ساز ادارے کو یہ

سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام میں محض ارتداد کی کوئی سزا مقرر نہیں۔ قرونِ اولیٰ میں جس سزائے قتل کا ذکر ملتا ہے وہ فساد فی الارض یا ریاست سے بغاوت کی سزا تھی جسے مسلمانوں نے غلطی سے یا مناسب غور و فکر کیے بغیر ارتداد کی سزا سمجھ لیا۔

فاضل مصنف نے زیرِ نظر تالیف میں سب سے پہلے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآنِ پاک میں ارتداد کی سزا کہیں قتل بیان نہیں کی گئی۔ دوسرے باب میں انہوں نے اس نقطۂ نظر سے سنت کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جن احادیث میں ارتداد کی سزا قتل بیان ہوئی ہے یا تو اُن احادیث کے راویوں میں سے بعض کاذب اور مُتّہم ہیں لہٰذا استدلال کے قابل نہیں یا راویوں نے محض الفاظ نقل کر دیے ہیں اور اُن کے پس منظر کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ تیسرے باب میں خلافتِ راشدہ کے امثال و نظائر سے بحث کی ہے۔ اور چوتھے باب میں فقہاء کے اقوال و آراء سے۔ جیسا کہ ہم پہلے خود مصنف کے حوالہ سے درج کر چکے ہیں اس پوری کتاب میں انہوں نے جس نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے اور اگر ارتداد کی سزا قتل مان لی جائے تو اس سے ایک تو انسان کی آزادیٔ ضمیر متاثر ہوتی ہے دوسرے دنیا میں انسان کی آزمائش کا مقصد فوت ہو جاتا ہے کیونکہ اس طرح اسلام سے منحرف ہو جانے کی خواہش رکھنے والا ایک شخص قتل کے ڈر سے انحراف نہیں کر سکے گا اور دامنِ اسلام سے وابستہ رہے گا اور یہ جبر و اکراہ پر مبنی وابستگی اسلام کی عطا کردہ آزادیٔ انتخاب کے منافی ہے۔

فاضل مصنف کی "محققانہ تصنیف" کے مندرجات کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے ہم دو بنیادی باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلی بات جو اس کتاب کے مطالعہ سے کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پس منظر میں اسلام کا وہی محدود تصور کارفرما ہے جس کا مغرب کی یلغار کے بعد بڑے زور و شور سے پرچار کیا جا رہا ہے۔ اس تصور کے تحت اسلام محض چند عقائد کا مجموعہ ہے جن کا عملی زندگی سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں۔ اس بناء پر ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ ان عقائد کو اپنی مرضی سے جب چاہے اختیار کرے اور جب چاہے ترک کر دے۔ ان کے ترک و اختیار سے معاشرتی ڈھانچے، نظامِ مملکت اور نظامِ معیشت پر قطعاً کوئی اثر نہ پڑے بنا بریں لوگوں کو تبدیلیٔ مذہب کی عام اجازت ہو اور اس اجازت کو آزادیٔ ضمیر سمجھا جائے۔ مذہب کا یہ تصور چونکہ مسیحی مشنریوں کے مقاصد کی تکمیل میں ممد و معاون تھا اس لیے مغربی سامراج نے جس جگہ بھی اپنا

تسلط قائم کیا وہاں مذہب کے اس محدود تصور کی خوب تبلیغ کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمیں ارتداد کی سزا قتل ایک انتہائی سفاکانہ اور انسانی ضمیر پر ایک ناروا قدغن دکھائی دیتی ہے درآنحالیکہ تمام آئمہ اور فقہا اِس بارے میں متفق و متحد ہیں کہ جو شخص اسلام لانے کے بعد دینِ حق کو چھوڑ دیتا ہے وہ واجب القتل ہے۔ اگر اس طرزِ فکر کے حامی اسلامی عقائد اور مسلم معاشرے کے مابین جو گہرا ربط ہے اسے نگاہ میں رکھتے اور یہ سوچتے کہ دینِ حق کو قبول کرنے کے بعد چھوڑ دینے سے اس معاشرے کی چولیں کس طرح ہل جاتی ہیں تو وہ کبھی ارتداد کی سزا کو سفاکانہ نہ کہتے۔

دوسری بات جو اس کتاب کے آغاز سے لے کر اختتام تک قاری کے ذہن میں کھٹکتی ہے وہ دین میں سنتِ رسول کے مقام و مرتبہ سے متعلق ہے۔ فاضل مصنف نے سنت کے بارے میں قریب قریب وہی موقف اختیار کیا ہے جو "بعض روشن خیال" آج کل اختیار کیے ہوئے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے قرآن کا نام لے کر سنت کی حیثیت کو گرایا جائے۔ اور عوام کو یہ تاثر دیا جائے کہ جو چیزیں سنت میں موجود ہیں مگر ان تجدد پسندوں کے نزدیک ان کی تائید میں قرآن مجید خاموش ہے انھیں دین میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ سنت میں جو احکام موجود ہیں ان کی حیثیت تو اُن وقتی اور ہنگامی فرامین اور فیصلوں کی تھی جو حضورؐ سرورِ کائنات نے اُس وقت کے مخصوص حالات میں صادر فرمائے۔ اس لیے وہ دین میں کسی مستقل قدر و قیمت کے حامل نہیں ہو سکتے۔ سنت سے استدلال کرتے ہوئے بھی فاضل مصنف نے وہی طریق کار اختیار کیا ہے جو عام طور پر متجددین کرتے ہیں کہ جہاں کوئی چیز اپنے موقف کی تائید میں ملی وہاں تو کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی اپنے موقف کو مضبوط بنانے کی کوشش کی اور جہاں کوئی چیز اپنے موقف کے خلاف پائی وہاں صحیح سے صحیح حدیث میں بھی کوئی نہ کوئی سقم نکال کر اسے رد کر دیا۔

تیسری بات جو کتاب کا مطالعہ کرتے وقت خاص طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تحقیق کا وہی انداز اختیار کیا گیا ہے جو دنیائے مغرب میں "ریسرچ" کے نام سے اس وقت رائج ہے کہ پہلے ایک خیال کو ذہن میں بٹھا لیا جائے اور پھر اسے صحیح ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جائے۔ اور اس کام کے لیے جہاں ضرورت پڑے حقائق کو بلاتکلف نظرانداز یا مسخ کر دیا جائے۔

ان ابتدائی معروضات کے بعد اب ہم فاضل مصنف کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:

آیاتِ قرآن سے استدلال | فاضل مصنف نے شروع ہیں:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔
فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۔
وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۔
قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۔
مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۔ اور
لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۔ اور اسی مفہوم کی

دوسری آیات درج کر کے یہ بنیادی اصول اخذ کیا ہے کہ قرآن اُن لوگوں کے لیے ۔ جو صداقت کی روشنی سے محروم ہوں یا جو اسلام کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ اتار پھینکنا چاہیں ۔ آزادی و رواداری کا ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے اُن کے نزدیک قرآن اچھی زندگی کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے لیکن انسانی عظمت و آزادی کو کچل کر اور دبا کر نہیں ۔

لیکن ہم عرض کریں گے کہ مندرجہ بالا آیات تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرتی ہیں ۔ یعنی دنیائے دارالعمل میں ہر انسان کو صحیح و غلط کے انتخاب کی آزادی ہے لیکن کیا یہ آزادی لا محدود ہے ؟ اور جس صورت میں بھی ظہور کرنا چاہے وہ قرآن کے نزدیک گوارا اور قابلِ قبول ہے ؟ قرآن ہی کی درج ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو جائے گا کہ ایسا ہرگز نہیں ۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۔ (آل عمران : ۸۵)	اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا ۔
وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (البقرہ : ۱۹۳)	اور تم ان سے لڑائی کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے ۔
هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ	وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ

كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (التوبۃ: ۳۳)

اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے اگرچہ مشرکوں کو یہ ناگوار ہی گزرے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبۃ: ۷۳)

اے نبی کفار اور منافقین کے ساتھ بھرپور جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان: ۵۲)

پس اے نبی کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (آل عمران: ۱۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے مامور کیا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اسلام کے سوا کوئی دین قبول نہیں نہ شروع سے ہی کسی کا کافر ہونا قبول ہے اور نہ اسلام اختیار کرنے کے بعد کافر ہو جانا۔ دوسری آیت میں فرمایا کہ کفار سے لڑائی کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فتنہ کیا ہے؟ کفار کو مسلمانوں کا قبولِ اسلام ہی تو کھلتا تھا۔ اگر مسلمان دوبارہ کفر کی طرف پلٹ جاتے تو کافروں کو ان سے کوئی شکایت باقی نہ رہتی۔ آیت پاک میں اسی رجوع الی الکفر کو فتنہ قرار دیا گیا ہے۔ کافروں کو مسلمانوں کا عروج اور اسلام کی بالادستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اور وہ دوبارہ کفر کی سربلندی کے لیے کوشاں تھے۔ قرآن سربلندئ کفر کے لیے کوشش کو فتنہ قرار دے کر اس کے مکمل سدِ باب کا حکم دے رہا ہے۔ تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کا مقصدِ بعثت بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول کو تمام ادیان پر دینِ اسلام کو غالب کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ بعد کی آیات میں کفار و منافقین کے ساتھ جہاد کبیر کرنے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم دیا ہے نیز امتِ مسلمہ کو یہ تعلیم بھی دی ہے کہ دنیا کو منکر سے باز رکھو۔

یہاں ہم فاضل مصنف سے یہ پوچھتے ہیں کہ آزادئ ضمیر اور عظمتِ انسانی کی بات بجائے خود درست ہی سہی لیکن یہ جو فرمایا جا رہا ہے کہ دینِ اسلام کے سوا کوئی دین قبول نہیں کیا جائے گا تو کیا یہ اس لیے فرمایا جا رہا

ہے کہ آپ شوق سے مرتد ہوا کریں ہم آپ کا ارتداد قبول کر لیں گے پھر یہ بھی سوچیئے کہ "قبول نہیں کیا جائے گا" کا جملہ سزا، جزا یا رواداری میں سے کس کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ جب تک فتنہ کا مکمل سدِ باب نہ ہو جائے جہاد و قتال جاری رکھو۔ یہاں فتنہ سے مراد کیا چیز ہے؟ کفار اگر مسلمانوں سے لڑائی کرتے تھے تو اس کا سبب کیا تھا۔ یہاں فتنہ سے مراد "کفار کا مسلمانوں سے لڑنا" بہر حال نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ فتنہ قتل سے زیادہ سخت اور بڑی بُرائی ہے اور لازماً وہ بڑی برائی قتل کے علاوہ کوئی اور ہے۔ مگر فاضل مصنف ہیں کہ اس برائی (رجوع الی الکفر) کو نہایت ہلکی اور معمولی چیز قرار دے رہے ہیں۔ مزید براں قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت غلبۂ دین بیان کرتا ہے۔ غور کیجیے کہ کیا غلبۂ دین کا عظیم الشان کام ہر کافر و مرتد کو مکمل آزادئ ضمیر دے کر اور ان کی سرگرمیوں کو برداشت کرتے ہوئے انجام پا سکتا ہے۔ اور اگر یہ کام کفار و مرتدین اور مشرکین کو ادنیٰ تکلیف پہنچے بغیر ہو سکتا تو قرآن وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ اور وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ کا اضافہ نہ کرتا۔ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ اور وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ نے کفار و منافقین سے جہاد و قتال کرنے اور ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ فاضل مصنف صاحب کہتے ہیں کہ جہاد و قتال صرف ان کفار و منافقین سے کیا جائے گا جو مسلمانوں سے لڑائی کریں یعنی جو (ACTIVE AND WARRING ENEMIES) ہوں۔ ٹھیک ہے ان سے لڑائی کی جائے گی مگر جو کفار و منافق عملاً برسرِ پیکار نہ ہوں انہیں کھلی چھٹی بھی نہیں دی جائے گی۔ قرآن کا یہ حکم جہاد و قتال مطلق ہے لہٰذا یا تو صاحبِ تصنیف یہ ثابت کریں کہ ہر کافر اور منافق (ACTVIE ENEMY) تھا اور یہ ثبوت قرآن سے ملنا چاہیے یا پھر انہیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ مذکورہ بالا آیات کے بعد اسلامی معاشرہ میں غیر مسلموں اور مرتدوں کو وہ نام نہاد آزادی (FREEDOM) نہیں دی جا سکتی کہ جس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ زیر و زبر ہو جائے۔ اور دین بازیچۂ اطفال بن جائے۔ آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کی ایک صفت نہی عن المنکر بھی بیان فرمائی ہے۔ فاضل مصنف جو دورِ جدید میں اسلام کو بڑا فراخ دل اور روادار مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں اور مرتدوں اور غیر مسلموں کے لیے مکمل آزادئ ضمیر کے ترجمان ہیں کیا اس امر کی وضاحت کرنا پسند کریں گے کہ اس آیت میں لوگوں کو منکرات سے روکنے کا جو اختیار امتِ مسلمہ کو دیا گیا ہے اس اختیار سے لوگوں کی آزادی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نیز

گئے ہاتھوں یہ بھی بتا دیا جائے کہ ارتداد بھی منکرات میں داخل ہے یا نہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے تصویر کا جو دوسرا رخ سامنے آتا ہے اس سے صاحب تصنیف کا اخذ کردہ یہ نتیجہ — کہ جو لوگ صداقت کی روشنی سے محروم رہنا چاہیں یا جو اسلام کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ گلے میں ڈالنے کے بعد اتار کر پھینک دیں قرآن اُن کے لیے آزادی و برداشت کا ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے — غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

آیت لا اِکراہ فی الدین کو صاحبِ موصوف نے خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے اور بڑے زوردار انداز میں اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دین میں کسی طرح کے جبر و اکراہ کی کوئی گنجائش نہیں نہ دینِ اسلام قبول کرنے پر کسی کو مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ دین سے انحراف و ارتداد کے راستے میں کوئی رکاوٹ ڈالی جا سکتی ہے۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے اُس سے تو کسی کو اختلاف نہیں۔ لیکن دوسری بات یعنی ارتداد کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے سے یکسر اجتناب البتہ محلِ نظر ہے۔ سوال یہ ہے کہ دینِ اسلام کو قبول کرنے والا اگر اپنی آزاد مرضی سے چوری کرے تو ہاتھ کاٹنے کا جبر جائز، آزادئ ضمیر کے تحت زنا کر بیٹھے تو سو کوڑے کھانے پر مجبور کرنا بھی جائز تاہم اگر خدا و رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کرنے والا اس عہد سے منحرف ہونا چاہیے اور اسلامی نظامِ حکومت اس سب سے بڑے عہد کو زندہ رہنے کا حق نہ دے تو یہ جبر آخر ناجائز کیوں؟ اسلام جب نام ہی خدا و رسول کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں قبول کرنے کا ہے تو یہ پابندی کہ قبولِ اسلام کے بعد ارتداد کی اجازت نہیں — نامنظور کیوں؟ کون سی عقلی، اخلاقی اور شرعی بنیاد کی رو سے یہ غلط ہے۔ اور اگر کسی کو یہ پابندی قبول نہیں تو وہ اسلام کو اختیار ہی کیوں کرتا ہے؟ ہمارے سابق چیف جسٹس کے ساتھ اگر کوئی شخص بار بار عہد و پیمان کر کے انحراف کرتا چلا جائے اور انہیں کئی طرح کے نقصانات پہنچاتا رہے تو اُس کے خلاف تو موصوف کو قانونی کارروائی کا حق حاصل ہو اور وہ انسانی آزادی کو کچلنے کے درپے ہو جائیں لیکن انحراف و ارتداد کا یہ سنگین مذاق اگر کوئی بدطینت خالقِ کائنات کے ساتھ روا رکھے تو اس کی کھلی اجازت ہو اور کم از کم دنیا میں اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے۔ یہ منطق ہماری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔

مذکورہ بالا گذارشات تو اُس نام نہاد آزادی سے متعلق تھیں جو ہمارے بعض کرم فرما پاکستان میں دین و ایمان کے دائرہ کے اندر جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور جس کا آئے دن ان کے مغربی آقاد

امام پرچار کرتے رہتے ہیں۔

اب ہم اُن آیات کا جائزہ لیتے ہیں جن سے کتاب میں اس امر کے لیے استدلال کیا گیا ہے کہ قرآن میں ارتداد کی سزا قتل نہیں

(۱) وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔
(البقرہ: ۲۱۷)

اور تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔

(۲) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ۔
(آل عمران: ۹۰)

جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے ان کی توبہ بھی قبول نہ ہو گی ایسے لوگ تو پکے گمراہ ہیں۔

(۳) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۔
(النساء: ۱۳۷)

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہِ راست دکھائے گا۔

(۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ۔
(المائدہ: ۵۴)

اے ایمان لانے والو اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دیگا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ اُن کو محبوب ہو گا۔

جناب ایس اے رحمان صاحب نے مندرجہ بالا آیات اور اسی مضمون کی چند اور آیات نقل کرنے کے بعد اس نکتہ کو زوردار طریقے سے بتکرار بیان کیا ہے کہ دیکھ لیجئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے

کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے کا ذکر کیا ہے مگر اس ارتداد کی سزا کہیں قتل بیان نہیں کی البتہ آخرت میں سزا دینے کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں ہماری معروضات حسب ذیل ہیں:

(۱) یہ امر معلوم و مسلّم ہے کہ قرآن پاک کا نزول حالات و مواقع کی مناسبت سے ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بالعموم آیاتِ تربیت و اصلاح اور تزکیۂ نفس مکی زندگی میں نازل ہوئیں اور آیاتِ احکام کا نزول جیسے جیسے حالات و ضروریات داعی ہوئیں مدینہ منورہ میں جا کر ہوا۔

(۲) ارتداد کی سزا قتل ہر شخص دینے کا مجاز نہیں نہ انسانوں کا کوئی گروہ اور جماعت جو اختیاراتِ حکومت سے محروم ہو بلکہ یہ کام اسلامی حکومت کے کرنے کا ہے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں مکمل اقتدارِ حکومت فتح مکہ کے بعد آیا۔

(۳) کتاب میں ایک ترتیب سے جو آیات نقل کی گئی ہیں اور جن میں مذکورہ بالا مضمون بیان ہوا ہے وہ سورۃ بقرہ، سورۃ آلِ عمران، سورۃ النساء، سورۃ المائدہ، سورۃ النحل اور سورۃ الحج کی آیات ہیں۔ اب ایک نظر ان سُور کے زمانۂ نزول پر ڈال لی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کن حالات میں مذکورہ آیات نازل ہوئی ہیں نیز یہ کہ آیا وہ حالات ایسے تھے کہ ان میں ارتداد کی سزا کا حکم بیان کیا جاتا یا اُس کا نفاذ عمل میں لایا جا سکتا۔

سورۃ بقرہ کا بیشتر حصہ ہجرتِ مدینہ کے بعد مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوا ہے سود کی ممانعت والی آیات البتہ بہت بعد نازل ہوئیں۔ اور سورۃ کا خاتمہ جن آیات پر ہوا ہے وہ ہجرت سے قبل مکہ میں نازل ہو چکی تھیں۔ سورۃ النساء کی مندرجہ بالا آیت جس سلسلۂ کا حصہ ہیں وہ جنگِ بدر کے بعد قریب کے زمانے میں نازل ہوا۔ سورۃ النساء متعدد خطبوں پر مشتمل ہے جو غالباً ۳ھ کے اواخر سے لے کر ۴ھ کے اواخر یا ۵ھ کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے۔ سورۃ المآئدہ کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ کے اواخر یا ۷ھ کے اوائل میں نازل ہوئی۔ سورۃ النحل کا زمانہ نزول مکہ کا آخری دور ہے۔ سورۃ الحج کا ایک حصہ مکی دور کے آخر میں اور دوسرا حصہ مدنی دور کے آغاز میں نازل ہوا ہے۔ (ماخوذ از تفہیم القرآن)

مندرجہ بالا سُور کے زمانہ ہائے نزول کے تعین سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ حالات

ایسے بہر حال نہیں تھے کہ ان میں ارتداد کی سزا دی جا سکتی۔ اور قرآن کا معمول بہ اصول بھی یہ نہیں کہ وہ بہت پہلے ایک ایسا حکم صادر کر دے جس پر عمل درآمد سالوں بعد جا کر ہونا ہو۔

(۴) جن حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں ان میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا تھا کہ دین کے ساتھ اس نوعیت کا مذاق کرنے والوں کو تنبیہ کی جاتی انہیں آخرت کے عذاب النار سے ڈرایا جاتا۔ دنیا میں قبولِ اسلام کے نتیجے میں جو حقوق و مراعات انہیں حاصل تھیں وہ سلب کر لی جاتیں۔ ان کی مغفرت کا دروازہ بند کر دیا جاتا اور ان کی توبہ تک بھی قبول نہ کی جاتی۔

(۵) یہ تو وہ آیات تھیں جو سزائے ارتداد کے باب میں خاموش ہیں۔ اب سورۃ التوبہ کی ایک آیت ملاحظہ کیجیے جس میں واضح طور پر ارتداد کی سزا (قتل) کا ذکر کیا گیا ہے۔

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَإِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝ (التوبة : ۱۲)	پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کر رہے ہیں جو جانتے ہیں۔ لیکن اگر وہ عہد (قبولِ اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر زبانِ طعن دراز کریں تو پھر کفر کے لیڈروں سے جنگ کرو۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ وہ اس طرح باز آجائیں۔

یہ آیت سورۃ توبہ میں جس سلسلے میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ۹ھ میں حج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اعلانِ براءت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اعلان کا مفاد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک خدا اور اس کے رسول کے ساتھ لڑتے رہے ہیں اور ہر طرح کی زیادتیوں اور بد عہدیوں سے خدا کے دین کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اُن کو اب زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس مدت میں وہ اپنے معاملے پر غور کر لیں۔ اسلام قبول کرنا ہو تو قبول کر لیں معاف

کر دیے جائیں گے۔ ملک چھوڑ کر نکلنا چاہیں تو نکل جائیں مدتِ مقررہ کے اندر اُن سے تعرض نہ کیا جائے گا اِس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائیں جنہوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو اور نہ ملک چھوڑا ہو اُن کی خبر تلوار سے لی جائے گی۔ اِس سلسلہ میں فرمایا گیا کہ "اگر وہ توبہ کر کے ادائے نماز و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد وہ پھر اپنا عہد توڑ دیں تو کفر کے لیڈروں سے جنگ کی جائے" یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں لی جاسکتی بلکہ سیاقِ عبارت صریح طور پر اِس کے معنی "اقرار اسلام سے پھر جانا" متعین کر دیتا ہے اور اِس کے بعد فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ مرتدین یا کفر کی تحریک کو تقویت پہنچانے والوں سے جنگ کی جائے۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ میں ایک قراءت اِنَّهُمْ لَآ اِيْمَانَ لَهُمْ بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قبولِ اسلام کا عہد توڑنے اور دین میں طعن کرنے والوں کا کوئی ایمان نہیں لہٰذا ان کے خون اور اموال کی حفاظت کا کوئی جواز نہیں۔ (فتح القدیر للعلامہ الشوکانی) اس دوسری قراءت کی رو سے مذکورہ آیت، زیر بحث مسئلہ میں اور بھی صریح اور واضح ہو جاتی ہے۔

(۶) یہ حکم اُس وقت نازل ہوا جب عرب میں اسلامی حکومت کی بنیاد پڑ چکی تھی اور مکمل اقتدار آپؐ کے ہاتھ میں تھا چنانچہ اس پر بلا تاخیر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اور خود حضورؐ سرورِ کائنات کے عہدِ مبارک میں قتلِ مرتد کا ایک واقعہ یمن میں پیش آیا۔ اگر یمن کے گورنر کا یہ قتل واقعی اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ پر مبنی نہ ہوتا تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس پر یمن کے گورنر سے باز پرس فرماتے۔

(۷) عجیب بات ہے کہ فاضل مصنف نے یہ ثابت کرتے وقت کہ قرآن میں ارتداد کی سزا قتل کہیں مذکور نہیں جن مفسرین کے تفسیری اقوال نقل کیے ہیں اور جن شخصیات کی کتب کے حوالے دیے ہیں وہ خود ارتداد کی سزائے قتل کے قائل ہیں اب اسے ذہن کی فنکاری ہی کہا جا سکتا ہے کہ قائلینِ سزائے ارتداد کے حوالہ جات دے کر انکارِ سزائے ارتداد کیا جا رہا ہے۔

سزائے ارتداد سنت میں اپنی کتاب کے دوسرے باب میں فاضل مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنتِ رسول میں بھی ارتداد کی سزا قتل نہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے انہوں نے خود سنت کی حقیقت بیان کی ہے۔

امام شاطبی کی موافقات، امام شافعی کے الرسالہ اور شاہ ولی اللہ کے حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم وغیرہ کے حوالے سے آپ لکھتے ہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ سنت ایک ثانوی درجہ کی چیز ہے۔ خبرِ واحد جو قرآن کے خلاف ہوگی اسے رد کر دیا جائے گا۔ صحیحین اور الموطا پہلے درجہ کی قابلِ اعتماد کتبِ حدیث ہیں۔ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی کی سنن اور مسند احمد دوسرے درجہ کی اور باقی تمام کتبِ حدیث ناقابلِ اعتماد ہیں۔ خبرِ واحد کے ضمن میں ایک اور بات جس کی خاص طور پر نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ راویانِ حدیث کا سہو و نسیان اور کسی حدیث سے متعلقہ صورتِ حال کو سمجھے بغیر روایت کرنا۔

احادیث و سنت میں ارتداد کی سزا کے بیان سے پہلے اس نوعیت کی تمہید ناقابلِ فہم نہیں۔ احادیث کے معاملہ میں مصنف جو مخصوص ذہن رکھتے ہیں اہلِ علم اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس تمہید میں بیان کردہ امور کے بارے میں ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ انھوں نے اسے لکھ کر عام مسلمانوں کی نظر میں حدیث و سنت کے مقام کو گرانے کی کوشش کی ہے۔

یہ کسی کا بھی مسلک نہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ حدیث قرآن پاک کی تبیین و تشریح کرتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ حدیث و سنت کی تبیین و تشریح کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے[۵۱]۔ رہا سنت کا ثانوی درجہ کی ایک چیز ہونا تو اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ سنت کتاب اللہ کے بعد دوسرا شرعی ماخذ ہے تو ٹھیک ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ جس تناظر میں یہ بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اصل ماخذ شرعی تو قرآن ہے سنت البتہ ایک ثانوی درجہ کی چیز ہے جسے ہر حال میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مغالطہ انگیز طرزِ کلام اختیار کر کے صاحبِ تصنیف کوئی کارِ خیر انجام نہیں دے رہے ہیں۔ جمہور اہلِ سنت قرآن ہی کی طرح سنت کو بھی ماخذِ شرعی مانتے ہیں۔ شریعتِ اسلامیہ جس طرح قرآن سے ثابت ہوتی ہے اسی طرح احادیث و سنت سے ثابت ہے[۵۲]۔ پس احادیث کی اہمیت

---

۵۱ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴)

۵۲ امام ابن قیم، اعلام الموقعین میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فامر تعالٰی بطاعته وطاعة رسوله	اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی اور اپنے
واعاد الفعل اعلاما بان طاعة الرسول	رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور الرسول

(بقیہ حاشیہ)

گھٹانے کی نہیں بلکہ بتانے کی ضرورت ہے اس سلسلہ میں امام اوزاعیؒ کا یہ قول یاد رکھنے کی چیز ہے۔ الکتٰب احوج الی السنۃ من السنۃ الی الکتاب۔ (قرآن پاک اس سے زیادہ سنت کا محتاج ہے جتنا کہ سنت قرآن کی محتاج ہے)۔ صحابہ کرام کی نظر میں سنت کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل حدیث سے لگایا جاسکتا ہے:

عن عبد اللہ بن مسعود قال لعن اللہ الواشمات والمستوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغیرات خلق اللہ	حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ اللہ نے لعنت بھیجی ہے سوئی چبھو کر حسین بننے والی عورتوں پر اور سوئی چبھونے کا مطالبہ کرنے والیوں پر اور

بقیہ حاشیہ صفحہ

تجب استقلالا من غیر عرض ما امر به علی الکتاب بل اذا امر وجبت طاعته مطلقا سواء کان ما امر به فی الکتاب او لم یکن فیه۔ فانه اوتی الکتاب و مثله معه و لم یامر بطاعة اولی الامر استقلالا بل حذف الفعل و جعل طاعتهم فی ضمن طاعة الرسول۔	کے لیے اطیعوا کے فعل کا اعادہ اس لیے کیا ہے تاکہ رسول کی اطاعت مطلق طور پر واجب ہو جائے بغیر اس کے کہ رسول کے حکم کو کتاب اللہ کے آگے پیش کیا جائے۔ لہٰذا رسول جب حکم دے تو اس کی اطاعت مطلقاً واجب ہو جاتی ہے چاہے وہ حکم کتاب اللہ میں موجود ہو یا نہ۔ اس لیے کہ اسے کتاب بھی دی گئی ہے اور اس کا مثل (سنت) بھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اولی الامر کی اطاعت کا حکم مطلق طور پر نہیں دیا بلکہ ان کے لیے اطیعوا کے فعل کو حذف کر دیا اور ان کی اطاعت کو اطاعتِ رسول کے ضمن میں رکھ دیا۔ (اعلام الموقعین جلد اول ص ۴۸)

فجاءته امرأة فقالت انه بلغني انك لعنت كيت وكيت فقال ما لي لا العن من لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم ومن هو في كتاب الله فقالت لقد قرأت ما بين اللوحين فما وجدت فيه ما تقول. قال لئن كنت قرأتيه لقد وجدتيه اما قرأت مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. قالت بلى. قال فانه قد نهى عنه

(متفق علیہ)

چہرے سے بال نوچنے والی عورتوں پر اور دانتوں کو باریک کر کے ان کے مابین شگاف پیدا کرنے والی عورتوں پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے اس لیے کہ وہ اللہ کی بناوٹ کو بدل دیتی ہیں۔ اس حدیث کے روایت کرنے پر ایک عورت حضرت عبداللہ کے پاس آئی اور کہنے لگی مجھے خبر پہنچی ہے کہ آپ فلاں فلاں قسم کی عورتوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا میں کیوں لعنت نہ بھیجوں ان پر جنہیں خود رسول اللہؐ نے ملعون قرار دیا ہے۔ اور جن پر کتاب اللہ میں لعنت بھیجی گئی ہے۔ وہ عورت کہنے لگی میں نے پورے قرآن کو پڑھا ہے مجھے تو کہیں وہ بات نظر نہیں آئی جو آپ کہہ رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا اگر تو نے اسے پڑھا ہوتا تو تجھے ضرور وہ بات مل جاتی کیا تو نے یہ آیۃ نہیں پڑھی ما اٰتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا۔ جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ وہ عورت بولی ہاں یہ آیت تو پڑھی ہے حضرت عبداللہ نے فرمایا تو تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ رسول پاک نے ان کاموں سے منع فرمایا ہے ولہذا یہ ممانعت ایسی ہی ہے جیسے کہ اللہ نے کتاب اللہ میں بیان فرمائی ہو)۔

صحابہ کے دل و دماغ میں سنت کا یہ مقام بلند خود رسولِ پاک نے جاگزیں کیا تھا حضرت مقداد بن

معدیکرب راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگاہ رہو مجھے قرآن عطا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اتنا علم اور بھی بخشا گیا ہے۔ خبردار قریب ہے کہ کوئی شکم سیر آدمی اپنے پلنگ پر بیٹھ کر کہنے لگے لوگو اس قرآن کو لازم پکڑلو پھر جو کچھ تم اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام قرار دو حالانکہ اللہ کے رسول نے جس چیز کو حرام کر دیا اس کی حرمت بھی ایسے ہی ہے جیسے اللہ کی حرام کردہ چیز کی حرمت۔ (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) اسی طرح ایک اور مقام پر بھی آپ نے مقام سنت کی وضاحت فرمائی صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ ایک بدو نے رسول پاک کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں آپ میرے معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کریں۔ دوسرے فریق نے بھی کہا فاقض بیننا بکتاب اللہ۔ آپ نے دونوں کی بات سنی۔ صورت یہ تھی کہ ایک آدمی کے غیر شادی شدہ بیٹے نے دوسرے آدمی کی بیوی سے زنا کیا تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما بکتاب اللہ الولیدۃ والغنم رد وعلی ابنک جلد مائۃ و تغریب عام اغد یا انیس الی امراۃ ھذا فان اعترفت فارجمھا۔	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ لونڈی اور بکریاں تجھے واپس کی جاتی ہیں اور تیرے بیٹے کو سو کوڑے لگیں گے اور ایک سال کے لیے جلا وطن کیا جائیگا اور اے انس تم اس آدمی کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف زنا کرلے تو اسے رجم کر دینا۔

اس حدیث میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ کتاب اللہ میں کہیں تغریب عام کا ذکر نہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ یہ فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہے۔ اس سے جو کچھ بداہتًا مستفاد ہے وہ یہ ہے کہ سنتِ ثابتہ کا مقام بھی تشریع اسلامی میں کتاب اللہ جتنا ہی ہے۔

خبر واحد کے بارے میں یہ خیال کہ وہ قرآن کے خلاف ہو سکتی ہے غلط خیال ہے۔ کوئی صحیح حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہوتی یہ ہمارا قصورِ فہم ہے اگر وہ قرآن کے خلاف نظر آتی ہو۔ محققین نے ایسی احادیث میں تطبیق و موافقت دے کر ثابت کیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ کوئی خبر واحد جسے عادل و تام الضبط رواۃ نے بسندِ متصل روایت کیا ہو وہ قرآن کے خلاف نہیں بلکہ جمہور علماء نے ایسی احادیث کو قبول کیا ہے اور ان سے حجت

پکڑی ہے۔ صحیحین اور موطا کی اخبارِ آحاد کے متعلق شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا ہے:

اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علیٰ ان جمیع ما فیھما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع وانھما متواتران الیٰ مصنفیھما وانہ کل من یھون امرھما فھو مبتدع متبع غیر سبیل المؤمنین۔ (جلد ۱، ص۱۳۴)	جہاں تک صحیحین کی احادیث کا تعلق ہے تو محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان میں درج شدہ تمام متصل اور مرفوع روایات قطعی الصحت ہیں نیز یہ کہ وہ ان کے مصنفین تک متواتر ہیں۔ اور ہر وہ شخص جو صحیحین کا مرتبہ و مقام گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مبتدع ہے اور اہلِ ایمان کے راستہ سے ہٹ کر چلنے والا۔

اور موطا امام مالک کے بارے میں شاہ صاحب کا ارشاد ہے:

واتفق اھل الحدیث علیٰ ان جمیع ما فیہ صحیح علیٰ رای مالک و من وافقہ و اما علیٰ رائ غیرہ فلیس فیہ مرسل ولا منقطع الا قد اتصل السند بہ من طرق اخری فلا جرم انھا صحیحۃ من ھذا الوجہ۔	محدثین نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ موطا میں درج شدہ تمام روایات و آثار امام مالکؒ اور ان کے موافقین کے نزدیک صحیح ہیں۔ اور جو ان کے ہم مسلک نہیں ان کے نزدیک بھی اس میں اگر کوئی مرسل یا منقطع روایت آئی ہے تو وہ دوسرے طرق سے متصل السند ثابت ہو چکی ہے۔ پس اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس لحاظ سے موطا امام مالک کی روایات صحیح ہیں۔

اور یہ جو فاضل مصنف نے شاہ ولی اللہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ کتبِ حدیث جو تیسرے اور چوتھے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں وہ قابلِ اعتماد نہیں غلط ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تیسرے طبقے کی مسانید و جوامع میں صحیح و حسن، ضعیف و غریب اور شاذ و منکر روایات ملی جلی ہیں۔ ان کتبِ حدیث سے اہلِ علم ہی استفادہ کر سکتے ہیں اور انہی کے لیے صحیح و حسن روایات کو شاذ و منکر روایات سے الگ چھانٹ لینا ممکن ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

واما الثالثة فلا يباشر ها	تیسرے درجہ کی کتبِ احادیث کے مندرجات
للعمل عليها والقول بها الا	کو عمل کے لیے پیش کرنا یا ان کے بارے میں کچھ
النحارير الجهابذة الذين يحفظون	کہنا اُن بڑے بڑے اہلِ علم کا کام ہے جو
اسماء الرجال وعلل الاحاديث	اسماء الرجال اور علل الاحادیث کا علم رکھتے
نعم ربما يوخذ منها المتابعات	ہیں۔ اس طبقہ کی کتب میں سے اکثر متابعات
والشواهد	وشواہد حاصل کیے جاتے ہیں۔

گذارش کرنے کا منشا یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک تیسرے درجہ کی کتبِ احادیث میں مندرج تمام روایات ناقابلِ اعتماد نہیں بلکہ اہلِ علم جن روایات کو صحیح پائیں وہ قابلِ قبول ہیں اور لائقِ اعتماد۔ چوتھے درجے کی کتبِ احادیث مثلاً کتاب الضعفاء لابن حبان وکامل ابنِ عدی اور الخطیب، ابی نعیم، الجوزقانی، ابن عساکر، ابن نجار اور الدیلمی کی کتب اور الخوارزمی کی مسند پر انحصار و انتصار کو البتہ شاہ صاحب درست نہیں سمجھتے۔

آخری بات جو اس تمہید میں فاضل مصنف اپنے قاری کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ رواۃِ حدیث بہر حال انسان تھے ان سے بھول چوک ممکن ہے اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ رسولِ پاک کے کسی ارشاد کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھ ہی نہ سکے ہوں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت عمرؓ یا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت در بابِ عذابِ میت بھی نقل کی ہے جس کی توضیح و تصحیح حضرت عائشہؓ نے کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ ہر وہ روایت جو اس کتاب کے مصنف یا منکرینِ حدیث کو ناقابلِ قبول ہو — کی روایت میں راوی سے لازمی طور پر سہو ہو گیا ہے۔ سہو اگر کہیں ہوا ہے تو اس کی نشاندہی اُسی زمانے میں کر دی گئی نہ کہ اس کام کو بیسویں صدی کے دانشوروں پر چھوڑ دیا گیا۔ (باقی آئندہ)